© rasailojaraid.com

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

''مَیّا''

ایک تعارف......ایک تاثر

ماں کا موضوع اتنا دلکش، خوش نما اور خوبصورت ہے کہ جس صاحبِ قلم نے بھی اس پر لکھا اُنس والفت اور محبت ووارفتگی کے سارے رنگ یک جا کر دیئے۔رنگوں کی یہ دنیا کس قدر حسین، کس قدر بھلی اور کس قدر اعلیٰ وارفع ہے۔اور اس دنیا میں سرور و سرمستی کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو اپنا انوکھا مزاج اور رویہ رکھتی ہے۔اس محبت بھرے اور شفقت سے لبریز موضوع پر لکھنے والوں میں ایک نام جنابِ حامد سراج کا بھی ہے۔جنہوں نے اپنی ماں سے محبت کو ''میا'' کا نام دیا ہے۔

حامد سراج نے اپنی اس کاوش میں روایتی جملوں اور گھسے پٹے لفظوں کی بجائے مکالماتی اسلوب نگارش اختیار کر کے اس کتاب کو حیاتِ جاوداں عطا کر دی ہے۔اُنس والفت میں گُندھے ہوئے الفاظ کو ایسی خوبصورت لڑی میں پرویا ہے کہ جسے پڑھ کر پتھر سے پتھر دل لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آتے ہیں۔اور یادوں کے کئی دَر بھی وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

حامد سراج، میانوالی کے معروف قصبہ ''کندیاں'' سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ایک جیتی جاگتی بستی ''خانقاہ سراجیہ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔''مَیّا'' کے علاوہ ان کے افسانوں کے دو مجموعے (وقت کی فصیل ،اور برائے فروخت) بھی شائع ہو چکے ہیں۔''مَیّا'' دبیز کاغذ پر بہت ہی خوبصورت انداز میں چہار رنگے گرد پوش کے ساتھ شائع کی گئی ہے بقول پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم:

> ''افسانوی ادب پر اپنے قلم کے گہرے نقوش مرتسم کرنے کے بعد ماں جیسے آفاق گیر موضوع پر، لائن اور لینتھ برقرار رکھتے ہوئے، طویل مکالماتی خاکہ لکھ کر محمد حامد سراج نے دنیائے ادب میں اپنا مقام محفوظ کر لیا ہے۔''مَیّا'' میں کہانی کا سحر بھی ہے، رپورتاژ کا گہرا تاثر بھی، مرقع کشی کی نظر نوازی بھی ہے اور ڈرامے کی بیانیہ منظر نگاری بھی۔فقروں کی موزوں خشت کاری نے اسے ایک تخلیقی نثر پارہ بنا دیا ہے۔''

سرحد پار سے جناب مشرف عالم ذوقی نے اپنی تقریظ میں لکھا:

> ''ماں کا دکھ کس نے دیکھا ہے، ماں کا سکھ کس نے جانا ہے۔مَیّا کے مطالعہ سے گزرنے کے بعد، میں ہفتوں سو نہیں پایا۔مومن کا زمانہ ہوتا تو وہ کہتا۔''میرا سارا دیوان لے جاؤ مجھے ''مَیّا'' دے دو''۔جن کے پاس مَیّا ہوتی ہے، وہی جانتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کی کتنی بڑی طاقت ہے۔ایک بھائی اپنی دولت کی چمک، دوسرے بھائی کے سامنے گنواتے ہوئے پوچھتا ہے......''میرے پاس بنگلہ ہے، گاڑی ہے، دولت ہے، تمہارے پاس کیا ہے؟ دوسرا بھائی جواب دیتا ہے''میرے پاس ماں ہے۔''

حامد سراج کی یہ کہانی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی ہے انہوں نے اردو فکشن کی تاریخ میں ''مَیّا'' لکھ کر ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو اس سے قبل، کسی بھی قلم کار کے حصے میں نہیں آیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''میّا'' میں ماں کی عظمت کے تابندہ اور درخشندہ نقوش بھی ہیں اور ماں سے محبت کی انمٹ یادیں بھی۔ اِن نقوش اور یادوں سے پھوٹتی اور پھیلتی ہوئی روشنی سے ''میّا'' کو ایک شاہکار تصنیف کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ''میّا'' میں مکالماتی رنگ تو ہے لیکن ان مکالموں میں بھی نثری نظم کا گمان ہوتا ہے۔ ماں ایسے موضوع پر ایسی نثر پڑھنے کو بہت کم ملی ہے۔

ماں بستر کو گھر کرتی جا رہی تھی اور گھر خالی ہوتا جا رہا تھا
ماں کی آنکھ کے دریچوں میں
صرف دو بار آنسوؤں کے پرندے اُترے

آنکھوں کے سامنے ماں کا بچھڑنے کا عمل اس قدر دردناک اور اذیت ناک ہے کہ دل غم سے بھر جاتا ہے۔ ماں جیسی عظیم ہستی سے بچھڑنے کے اس دردناک عمل کو حامد سراج نے کس طرح بیان کیا ہے:

میں نے گھر میں دیکھا سارے وال کلاک تھم گئے تھے، وقت رُک گیا تھا
ائر کنڈیشنر دن رات چلتا رہا۔
ماں کے اندر کینسر کی گرمی سوا نیزے پر پہنچ گئی
دو آنسو گرے اور ماں نے چپ سادھ لی
ماں! کسی نے بین نہیں کیا، کوئی نوحہ نہیں ہوا۔
پورے وقار کے ساتھ تیرا جنازہ اٹھایا گیا اور تُو نے زمین اوڑھ کر آخرت کو گھر کر لیا
آج کیلنڈر تمام ہوئے

''میّا'' میں افسانہ نگار کہیں کہیں اللہ تعالیٰ سے فریاد کناں بھی ہے کہ ماں جیسی عظیم ہستی کو بھیج کر پھر اسے واپس کیوں بلاتا ہے۔ دنیا میں تنہا رہنا اور سائبان کے بغیر زندگی گزارنا ایک ایسا درد، ایسی بے بسی اور ایسی بے چارگی ہے کہ اسے وہی جان سکتا ہے جو اس نعمتِ عظمٰی سے محروم ہو گیا ہو اور جس سے یہ نعمتِ غیر مترقبہ چھن گئی ہو۔

اے ربِ کریم! تُو ماؤں کو کیوں بلاتا ہے، ساری عمر کے لیے دھوپ کا سائباں کیوں تان دیتا ہے۔
یُوں لگتا ہے دل کے توے پر لفظ جل گئے ہیں
جلے ہوئے لفظوں کی راکھ میں، انگلیاں پھیرتے ان گنت قرن گزر گئے
میں دشتِ تنہائی میں آبلہ پا، بے سائباں، کاندھے پر یادوں کی زنبیل اٹھائے، سایۂ شجر کا
متلاشی سوچ رہا ہوں کہ ماں کے بعد بھی کہیں کوئی سایہ ہوتا ہے؟
حامد سراج نے علامت نگاری کی ایسی دنیا آباد کی ہے جس میں حسن بھی ہے اور دل کشی بھی:
''میں نے اپنے دوست پروفیسر عبدالباسط کو خط لکھا
میں نے آنسو اُس کو پارسل کر دیئے
بھائی آیا مگر اس وقت میری آنکھ کی منڈیر پر آنسوؤں کا ایک پرندہ بھی نہیں تھا۔''

ماں کے چلے جانے کے بعد گھر، گرہستی اور گردوپیش کی حالت کیسی ہو جاتی ہے اور اداسیاں اور پریشانیاں اس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عود کر آتی ہیں کہ ماں کی جدائی کا دکھ شدید تر ہو جاتا ہے۔دنیا کی ساری رنگینیاں ،ساری خوشیاں اور ساری آسائشیں بے مزہ ،پھیکی پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔جب ماں رخصت ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ سایہ،ٹھنڈک ،میٹھی چھاؤں ،رونقیں ،مسکراہٹیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔بہار،خزاں جیسی معلوم ہوتی ہے،درخت بے برگ و بار دکھائی دیتے ہیں۔یہ منظر اور کیفیت حامد سراج کس خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے،ملاحظہ کریں:

ماں تمہارے جانے کے بعد کائنات بے روح ہوگئی ہے
چہرے ساکت،آسمان چپ،ستارے بے نور،سورج زرد،شجر خزاں رسیدہ اور ہوائیں کرلاتی رہتی ہیں۔
موسم سرکتے رہتے ہیں،آنکھیں تمہیں تلاش کرتی رہتی ہیں
دل کی نم زمین پر یادیں ننگے پاؤں ٹہلتی رہتی ہیں
موسم کے آنچل میں جتنے پھول تھے،رونقیں اور مسکراہٹیں۔سایہ اور ٹھنڈک میٹھی چھاؤں
سب کے سب تمہارے ساتھ رخصت ہوئے۔اب تو صرف دھوپ کا آنچل ہے

حامد سراج نے ''میّا'' میں بظاہر ایک سادہ سی کہانی بیان کی ہے مگر اس کے لفظوں میں رنگوں کی رم جھم اور جذبوں کے زیروبم کی نو بہ نو دنیائیں آباد ہیں۔ماں ہم سے رخصت ہوتی ہے تو یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اور یہ یادیں دلوں کو کچوکے لگاتی رہتی ہیں،دل غم سے نڈھال اور طبیعت میں بے قراری و بے چینی دَر آتی ہے۔اولاد کے لیے قیامت تو اس روز آجاتی ہے جب اس سے ماں جیسی عظیم ہستی اُس سے رخصت ہو جائے!

مگر اب کے ستم برنے......درخت منتہی پر ہاتھ کیوں رکھا
ستم برکیسے بولے گا......ستم برسے کوئی پوچھو
بریدہ شاخ بے جاں کی اذیت جاننے والے
کوئی زندہ درختوں پر بھی ایسے وار کرتا ہے
ماں!تُو اپنی یاد کے خیمے ساتھ لے جاتیں تو اچھا تھا
ان خیموں میں مکیں یادیں اداس رہتی ہیں
یہ یادیں دکھ کے چولہے پر آنسو ابالتی رہتی ہیں
درد میرے اندر کرلاتے رہتے ہیں
ماں!حوصلہ کس بازار میں بکتا ہے
کوئی تو چٹکی بھر......ہم کو بھی خرید کر لادے
ماں!تُو کہتی تھی
خدایا!میرے بچوں کو قیامت تک......سلامت رکھ!
تو پھر جاتے ہوئے،گھر میں
قیامت کیوں نہیں دیکھی!

© rasailojaraid.com